Al-Qalam القلم
p-ISSN: 2071-8683, e-ISSN: 2707-0077
Volume:27, Issue:2, 2022, pp. 165-178

عالمی جہادی فکر پر معاصر تنقیدات: معروضی جائزہ

Analytical review of Contemporary Literary Criticism of Global Jihadi Thought

Dr. Muhammad Samiullah
Associate Professor Islamic Thought & Civilization
University of Management & Technology, Lahore
muhammad.samiullah@umt.edu.pk

KEYWORDS

Global Jihad, reasoning system of ISIS, Criticism on Global Jihad, Jihad Interpretations.

Date of Publication: 26-12-2022

ABSTRACT

For any critical work on the global jihadist movement, it is essential that its reasoning be clear. Expressive to the nature of the argument and its examining the fortes or faintness has been the trend of contemporary western and Muslims' writings since last two decades. The problem of this discourse is to understand the reasoning system of contemporary global jihad which believes in armed conflict. The instantaneous understanding of this global jihadist reasoning system is the dire need of time that the world can assess the depth and breadth of its impact by scrutinising this narrative and its grounds to counter this thought. This research endeavour, would assist to global policy makers to understand that the religious and theological foundations of global jihadist do not have a scientific depth and its reasoning is weak in the tradition of religious sciences. It also been the objective of study to find out the causes of effectiveness of Jihadist political reasoning among those Muslims those have radical mind-set. This research paper is effort to give an impartial analysis of selected significant literature that has come up so far and this will make it thought provoking for the scholarly world to understand the nature of reasoning-system.

تعارف: (Introduction)

نو آبادیاتی نظام اور خصوصاً 1923 میں خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد سے مغربی ممالک اور ان کا فلسفۂ حیات دنیا پر غالب ہے۔ اس سے قبل مسلمانوں کی قوت دنیا پر غالب رہی ہے۔ جس طرح مسلم تاریخ میں دنیا کی قیادت مسلم اقوام میں ایک دوسرے کو منتقل ہوتی رہی ہے یا انہی کے درمیان منقسم رہی ہے، اسی طرح مغرب کے ہاں بھی قیادت انہیں میں سے مختلف اقوام میں منتقل ہوتی رہتی ہے یا پھر منقسم رہتی ہے، دو عظیم جنگوں کی نوعیت بھی مغربی اقوام کے درمیان قیادت کے لیے رسا کشی کی ہے، جس میں کچھ مشرقی اقوام بھی شریک رہی ہیں۔ یاد رہے کہ اشتراکیت اور اس کا نظام بھی فی الاصل مغربی تہذیب کے ضمن میں آتا ہے، جو بیسویں صدی کے اندر ایک بڑی قوت کے طور پر جانا جاتا تھا۔[1]

تہذیبوں کے تصادم (The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order By Samuel P. Huntington) اور تاریخ کا خاتمہ (The End of History and the Last Man by Francis Fukuyama) اپنی اساس میں اسی بات کی توثیق کرتا ہے۔

اس وقت دنیا کی صورت حال یہ ہے کہ مغربی دنیا اور اس کی تہذیب دنیا کی قیادت کر رہی ہے۔ معیشت اور معاشرت، فلسفہ و نظریہ، نظام اور تنظیم، سیاست و قیادت میں انہیں کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں، انہیں سے رہنمائی ملتی ہے اور دنیا کے معاملات میں انہیں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ تہذیبوں کے مابین مکالمہ و تصادم کی بحث ہر تہذیب میں زیر بحث آتی ہے، لیکن عصر حاضر میں اسلامی تہذیب اور مغرب کے درمیان مکالمے و تصادم کو اِن مباحث میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مغربی ممالک کی پالیسیز اور ان کے لائحہ عمل کو دیکھتے ہوئے واضح ہوتا ہے کہ پچھلی صدی اور خصوصا موجودہ صدی کی یہ دو دہائیاں مغرب اور اسلام کے درمیان آویزش یا کم از کم مکالمے کا دور ہے، اسی زمانے میں ان مباحث کو خصوصی حیثیت مل گئی ہے۔[2]

15، فروری 1989 میں افغانستان سے روس کے انخلا کے بعد براہ راست تصادم دو تہذیبوں کے مابین شروع ہوا، یعنی اسلام اور مغرب۔ "تہذیبوں کے تصادم" کے نام سے معروف ہونے والے بیانیے کو اگرچہ بعض مفکرین رد کرتے ہیں لیکن بہر حال اس نظریے کو علمی سند حاصل ہے اور مغرب و اسلام میں اس موضوع کو اسی حیثیت سے بہت آگے بڑھایا گیا ہے۔ دوسرا بیانیہ وہ ہے جو تصادم کی بجائے مکالمے کی بات سامنے لاتا ہے۔ اسی لیے ہم اس مقالے میں تصادم اور مکالمے دونوں کو استعمال کریں گے، کیونکہ دونوں کو علمی حیثیت حاصل ہے۔ اور دونوں میں موازنہ اور ترجیح قائم کرنا اس مقالے کے دائرے سے باہر ہے۔

مسلمانوں میں مغرب کے حوالے سے تین رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو مغرب اور مسلمانوں کے درمیان تعلق کو تصادم کے طور پر دیکھتا ہے، دوسرا رویہ وہ ہے جو مکالمہ و باہم دیگر استفادہ اور افہام تفہیم کا رویہ اپناتا ہے اور تیسرا رویہ نظر انداز کرنے کا ہے۔[3] تصادم کا رویہ عموماً اس فکر میں پایا جاتا ہے جس کو مغربی محققین تواتر کے ساتھ سیاسی اسلام، وہابیت، بنیاد پرست، شدت پسند، اسلام ازم وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ مکالمے اور استفادے کا رویہ اس طبقے میں پایا جاتا ہے، جس کو مغرب میں نیو اسلام ازم، ماڈرن اسلام، یا امریکن اسلام کے

ناموں سے پہنچانا جاتا ہے۔ اسی طبقے کو مسلمانوں کی اکثریت میں، اور خصوصاً پہلے گروہ کے لوگ متجددین کے نام سے پکارتے ہیں۔ تیسری قسم ان روایتی علما کی ہے جو بالکل روایتی انداز میں مدارس و مساجد کے اندر رہتے ہوئے اپنی دنیا میں مصروف ہیں۔ یہ طبقہ جدید مسائل میں براہ راست اور فعال حیثیت سے شامل نہیں ہے، حالانکہ یہ طبقہ بھی جدیدیت یا مغربی تہذیب کا مخالف ہے۔ لیکن صرف جدید تہذیب ہی کا مخالف نہیں ہے بلکہ جو طبقہ تصادم پر یقین رکھتا ہے، یہ اس کے بھی خلاف ہے کیونکہ یہ کسی بھی سطح پر جدیدیت کے ساتھ براہ راست ہونے کو غلط جانتا ہے۔ یہ بڑی تقسیم ہے، اس کو باریک اور گہری تقسیم تک لے جائیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ مفکرین بیک وقت ایک سے زائد رمزوں میں آئیں۔

تصادم والے گروہ کے اندر بھی بڑی تقسیم واقع ہوئی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے حالات کا جائزہ لیا اور مسلح جدوجہد کو تصادم کی ایک صورت کے طور پر مؤثر خیال کرتے ہوئے، جہادی فکر و تنظیم کی طرف چلے گئے، جن میں سے ایک بڑی مثال عبد اللہ عزام اور ایمن الظواہری کی ہو سکتی ہے جو اخوان المسلمون سے باقاعدہ وابستگی کے بعد تصادم کی طرف چلے گئے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے تھے جو تصادم والے گروہ سے مکالمے اور استفادے والے گروہ کی طرف چلے گئے، جن میں طارق رمضان، طیب اردوگان اور راشد الغنوشی وغیرہ شامل ہیں، جنہوں نے اپنی تحریک کو سیکولر بنیادوں پر از سر نو مرتب کیا۔ مذکورہ تقسیم میں ایک اہم قدر مشترک، ان کے بنیادی مفکرین ہیں۔ سید قطب اور سید ابو الاعلیٰ مودودی کو سیاسی اسلام، اسلام ازم کے بنیادی مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان مفکرین کی فکر کو تصادم و مکالمے پر یقین رکھنے والے دونوں گروہوں میں بیک وقت بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور اس کی بنیادی وجہ ان کی فکر میں ہر دو گروہوں کے لیے بنیاد فراہم کرنے والی فکر کا موجود ہونا ہے۔ مولانا مودودی کی فکر میں ایسا استدلال بھی موجود ہے جو تصادم پر منتج ہوتا ہے اور ایسی فکر بھی وجود ہے جس سے مکالمے کے لیے استدلال کرنا آسان ہے۔ اس حوالے سے معتدل رائے علامہ یوسف القرضاوی کی معلوم ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "میں ہمیشہ اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ مولانا مودودی کی کسی ایک تحریر کی بنیاد پر ان کے سلسلے میں کوئی بات نہ کہی جائے، ہم اس وقت تک ان پر کوئی حکم نہ لگائیں جب تک ان کی تمام تحریروں کو نہ دیکھ لیں۔ کیونکہ جس بات کو وہ ایک جگہ مطلق انداز میں لکھتے ہیں، اسی بات کو دوسری جگہ کچھ شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیتے ہیں۔ جس بات کو وہ ایک جگہ عموم کے ساتھ لکھتے ہیں، اسی بات کو دوسری جگہ خاص کر دیتے ہیں۔ جس بات کو وہ ایک خطاب میں مجمل طور پر کہتے ہیں، اسی بات کو وہ دوسری کتاب یا خطاب یا تحریر میں مفصل انداز میں بیان کرتے ہیں۔"[4]

ریڈیکل اسلام ازم، وہاب ازم، سیاسی اسلام اور مغربی فکر و تہذیب کے تقابلی تفہیم پر بہت کام ہو چکا ہے، یہ ایک وسیع و عریض میدانِ تحقیق ہے۔ اسی طرح ریڈیکل اسلام، وہاب ازم یا سیاسی اسلام وغیرہ ایسے عنوانات ہیں جن کے ضلعی مضامین وجود میں آ چکے ہیں اور ان کے اندر بھی ایک بڑی تقسیم پائی جاتی ہے۔ ہم نے اس مقالے میں اسی میدان کے ایک گوشے کو موضوع تحقیق بنایا ہے۔

جس طرح ہم نے اوپر لکھا ہے کہ مغربی تہذیب اور مسلم دنیا پر ان کی نظریاتی و سیاسی تسلط کے حوالے سے ایک رویہ مسلح جد وجہد کا ہے۔ زیر نظر مقالے میں ہم اسی مسلح جد وجہد کا رویہ رکھنے والی جہادی فکر کے نظام استدلال کا جائزہ لیں گے۔ اور اس استدلال پر جو تنقید سامنے آئی ہے اس کو کسی حد تک زیرِ بحث لاتے ہوئے، اس کا جائزہ لیں گے۔ مغرب کے ساتھ براہ راست مسلح تعامل میں عالمی جہادی تحریکوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مغرب اپنی فکر و عمل اور سیاسی و خارجہ امور میں عالمیت رکھتا ہے، اس لیے ان کو براہ راست مخاطب کرنے والے بھی عالمی جہادی تحریکوں سے متعلق جنگجو اور ان کے مفکرین ہی ہو سکتے ہیں۔ علاقائی جہادی تنظیموں کے بنیادی مقاصد علاقائی نوعیت کے ہوتے ہیں، جبکہ عالمی جہاد کے مقاصد کسی ایک علاقے تک محدود نہیں ہیں۔[5] تنظیم و تحریک اور اسی طرح علاقائی اور عالمی کے درمیان فرق ہم موجود مقالے میں ضمناً/ تمہیداً کریں گے۔

معاصر تحقیقات کا جائزہ:(Contemporary Literature Review)

جس طرح درج بالا سطور میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اس تحقیقی کام کا دائرہ عالمی جہاد کے لیے قائم ہونے والے نظام استدلال اور اس پر ہونی والی تنقید کا جائزہ ہے، لہذا سابقہ علمی کام کے لیے بھی اسی دائرے تک محدود رہے ہیں۔ سطور میں ہم اس علمی و تحقیقی کام جائزہ لیں گے جس نے براہ راست عالمی جہاد کے استدلالی نظام کو مخاطب کیا ہے، نیز وہ علمی مواد بھی زیر بحث آئے گا جس کا تعلق عالمی جہاد کے استدلال ہے۔

عالمی جہاد کا نظام استدلال دو طرح کا ہے، ایک وہ استدلال جس کی بنیادیں خالص مذہبی ہیں۔ جس میں مذہبی نصوص اور دینی روایت کو بطور نص استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرا استدلالی نظام موجود دور کے سیاسی نظام کی بنیاد پر استوار ہے۔ مذکورہ تقسیم مغربی محققین کے ہاں بہت اکثر استعمال ہوتی ہے۔[6] استدلال کو سمجھنے اور اس کا جائزہ لیناوقت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح استدلال کے جواب میں جو تنقید سامنے آئی ہے اس کو استدلال کی ان دو نوعیتوں کی مناسبت سے دیکھا جانا چاہئے۔

عالمی جہاد کے مذہبی استدلال کے سلسلے میں دنیا بھر میں بہت سا کام ہو چکا ہے۔ الولا والبراء کے عنوان سے جہادی فکر کا ایک پورا ڈسکورس ہے۔ الولا والبراء بنیادی طور پر سلفی نظام فکر کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ جواس ویگمیکر(Joas Wagemaker) نے دو مختلف مقالات میں اس فکر کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے کام کی نوعیت تنقید کی بجائے تفہیمی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عالمی جہادی فکر کو جاننے کے لیے ان کے تصورِ الولا والبراء کا جاننانہایت اہم ہے کیونکہ اسی کی بنیادی پر ان کے مذہبی استدلال کی عمارت کھڑی ہے۔ الولاء سے مراد، اللہ تعالی، اس کے دین اور اس کے ماننے والوں کے ساتھ وفاداری اور محبت کا تعلق اور البراء سے مراد اللہ کے دشمنوں، جس کو طواغیت کا نام دیا جاتا ہے، ان سے بغاوت، دشمنی، یا ذرا نرم لفظوں میں ان سے برات کا اعلان اور ان سے محبت نہ رکھنا ہے۔[7]

ہمارے لیے ویگمیکر کے مقالات کا جائزہ لینا اس لیے اہم ہے کہ انہوں نے اپنے ایک مقالے میں سلفی ڈسکورس کے اندر الولاء والبراء کے اشتراک اور اسی سلسلے میں سلفیوں کے ہاں اس کے اطلاق کے مختلف مناہج کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے سلفیوں کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے، جن میں ایک قسم وہ ہے جس کو انہوں نے اصلاحی سلفی (Purist Salafi) کا نام دیا ہے، دوسری قسم کو سیاسی سلفی (Politico) جبکہ تیسری قسم کو جہادی سلفی (Jihadi Salafi) کا نام دیا ہے۔ اور مذکورہ مقالے میں انہوں نے بڑی خوبی ساتھ ان تینوں اقسام میں الولا و البراء کے معاملے میں اشتراک و اختلاف کا ذکر کیا ہے۔[8]

ویگمیکر کی تحقیق کے مطابق الولا و البراء کے تصور کو سیاست، خارجہ پالیسیز اور عالمی معاہدات کے ساتھ ساتھ معاشرتی تعلقات تک پھیلانے میں المقدیسی کی فکر کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہماری نظر میں درست بات یہ ہے کہ معاشرتی معاملات میں الولا والبراء کا تصور المقدیسی سے قبل بھی بہت مضبوط تھا۔ کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کرنا یا کفار کو دوست بنانے کے بارے میں قرآن وحدیث کے جو احکامات بیان ہوئے ہیں اس سلسلے میں اہل علم میں ایک پوری روایت ہے جو معاشرتی معاملات میں برات پر یقین رکھتی ہے۔ معاشرتی وسیاسی معاملات میں الولا والبراء کے تصور کا جائزہ تیسرے اور چوتھے باب میں تفصیل سے ذکر ہو گا۔

سلفیت کی مختلف اقسام اور ان کے مابین فکری ہم آہنگی و اختلاف پر ویگمیکر کے علاوہ دیگر بہت سے محققین کام کر چکے ہیں۔ جنوبی ایشیا کے تناظر میں عالمی جہاد اور سلفیت و وہابی ازم کی دیگر اقسام کی تاریخ و تعلق پر کمار راما کرشنا (Kumar Ramakrishna) نے Delegitimizing Global Jihadi Ideology in South Asia کے عنوان سے وقیع مقالہ لکھا ہے۔ اس مقالے میں سلفیت کی باقاعدہ قسمیں تو نہیں لکھیں، لیکن مجموعی طور پر مقالہ میں انہی تین اقسام کے آپسی تعلق پر بات ہوئی ہے جو ہم ویگمیکر کے مقالے کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔ انہوں نے اصلاحی سلفی کے لیے ویگمیکر کے استعمال کردہ لفظ Purist کی بجائے Dakwah کا لفظ استعمال کیا ہے، جو غالباً تقوی کی معمولی سے بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کمار نے اپنے مقالے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلم معاشروں میں جہاد کو مذہبی بنیادوں کی بجائے سیاسی بنیادوں پر پذیرائی ملی ہے۔ ان کے خیال میں جہادی فکر کو بے روزگاری و پسماندگی کے ساتھ ساتھ جس چیز سے وسعت ملی ہے وہ مغربی اقوام کی سیاسی پالیسیاں ہیں۔ کمار کا خیال ہے ہے کہ انڈونیشیا کے لوگوں کو اوپر سے نیچے کی طرف آنے والی اسلامائزیشن زیادہ اپیل نہیں کرتی ہے۔ اوپر سے نیچے کی طرف آنے والی اسلامائزیشن سے مراد اسلامائزیشن کا وہ طریقہ کار ہے جو پہلے ریاست یا اجتماعیت کی اصلاح کروانا چاہتا ہے اور پھر اجتماعیت کی اسلام کاری کے بعد انفرادی اسلام کاری کی طرف یعنی نیچے کے طرف بڑھتا ہے۔ کمار کی تحقیق کے مطابق انڈنیشیا کی اکثریت تقوی (Dakwah) کے تصور کی حامی ہے، جس میں اسلامائزیشن کا آغاز معاشرے کی اصلاح سے ہوتا ہے۔[9]

کمار راما کرشنا کے مطابق گلوبل جہاد کے لیے اسلام سے متعلق امریکا کی خارجہ پالیسیز نے آکسیجن کا کردار ادا کیا ہے، جس کو پولیٹیکل آکسیجن کا نام دیتے ہیں۔ ان کے مطابق امریکا کی خارجہ پالیسیز، مسلم ممالک میں جاری بدامنیوں کو عالمی جہادی تحریک نئے جہادی ڈھونڈنے اور ان کو اپنی تحریک میں شامل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔

کمار راما کرشنا نے اپنے مقالے میں عالمی جہادی فکر کو غیر مؤثر بنانے کے لیے تجاویز بھی دی ہیں۔ ان کی تجویز ہے کہ مغربی دنیا کو چاہیے کہ وہ جہادی فکر کے مقابلے میں ہارڈ پاور کے بجائے سافٹ پاور استعمال کرے۔ نیز مسلم دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان ممالک میں دیرپا امن کی کوشش کرے۔ فلسطین، کشمیر، افغانستان اور دیگر مسلم ممالک جہاں امن و امان کی صورت حال دگرگوں ہے، وہاں امن قائم کر کے عالمی جہادی فکر کو بڑی حد تک شکست دی جا سکتی ہے۔

کمار کا مذکورہ مقالہ اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اس میں عالمی جہادی فکر کی سیاسی بنیادوں کو سمجھنے اور اس کے سیاسی نوعیت کے حل کے لیے تجاویز دی گئی ہیں۔ کمار نے مغربی اقوام کو مخاطب کرتے ہوئے ان کو تجویز دی ہے کہ عالمی جہادی تحریک کا نظریاتی سطح پر مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں موجود ایسے مفکرین کو اس میدان میں اتار دیا جائے جو جدید اسلام پر یقین رکھتے ہیں، جن میں شدت پسندی نہیں ہے اور جو جہادی فکر کے مخالف ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں تیونس کی سیاسی پارٹی النہضہ کے بانی راشد الغنوشی اور مغربی دنیا میں معروف، حسن البناء کے نواسے طارق رمضان کا ذکر کیا ہے۔[10]

سلفی ڈسکورس کی درست تقسیم کے لیے محققین نے طرح طرح سے ان کی تقسیم کی ہے، اور تقسیم کے سلسلے میں محققین کے ہاں اتفاق کو ڈھونڈنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ جس طرح کمار اور ویگمیکر نے سلفی ڈسکورس کی اندرونی فکری تقسیم کی ہے اسی طرح فرانسیس برگٹ (Francois Burgat) نے اسلامائزیشن کی تاریخی و زمانی تقسیم کی ہے، انہوں نے زمانی لحاظ سے اسلامائزیشن کو تین زمانوں میں تقسیم کیا ہے: ۱۔ نوآبادیاتی دور سے مسلم ممالک کی آزادی تک کا براہ راست تعامل؛ ۲۔ مسلم ممالک کی آزادی سے 1990 تک کا دور، جس میں عرب دنیا مغرب پر دار و مدار رکھتی تھی؛ اور ۳۔ 1990 کے بعد کا دور۔[11] حقیقت یہ ہے کہ مسلم ممالک کی آزادی سے لے کر اب تک عرب ممالک مغربی اقوام کو اپنا سہارا بناتی ہیں۔ برگٹ نے سہارے کے اس عمل کو مسلم ممالک کی آزادی سے لے کر 1990 تک کی خاصیت کہا ہے، جو کہ درست نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ 1990 کے بعد عالمی جہادی تحریک کے وجود اور اس کی پذیرائی میں عرب ممالک کی اس روش نے بھی اہم کردار ادا ہے۔ اسامہ بن لادن، جن کو عالمی جہاد کے بانیان میں شمار کیا جاتا ہے، ان کا عرب ممالک کے ساتھ بنیادی اختلاف ہی وہاں امریکہ کی موجودگی پر تھا۔ القاعدہ کے وجود اور اس کی ابتدائی تاریخ کے سلسلے میں اس اختلاف کو مغربی محققین کے ہاں تواتر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔[12]

تین مغربی محققین، ڈیون سپنگر (Davin R. Spinger)، جی ریگنز (James L. Regens)، ڈیوڈ ایگر (David N. Edger) کی مشترکہ کتاب "اسلامی شدت پسندی اور عالمی جہاد (Islamic Radicalism and Global Jihad)" میں عالمی جہادی فکر اور اس کی بنیادی وجوہات پر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ ان محققین کا خیال ہے کہ مسلم دنیا میں یہ تصور عام ہے کہ مغرب جاہلیت ہے اور خلافت گمشدہ متاع ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلح تصادم میں مسلم ممالک کی سیاسی صورت حال نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ان محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ

اگر القاعدہ کو کہیں قیادت مل گئی تو وہ اسی تناسب سے غیر مسلموں کو قتل کریں گے جس تناسب کے ساتھ مسلمانوں کو قتل کیا گیا ہے۔[13]

درج بالا دونوں محققین کے مقالات میں جہادی فکر کے استدلال اور اس کی بنیادوں پر جو شکل سامنے آئی ہے، اس کی تفصیل علامہ یوسف القرضاوی کی کتاب "الصحوۃ الاسلامیۃ بین الجحود والتطرف" میں ہمیں ملتی ہے۔ اس کتاب میں ایک دو مقامات کے علاوہ کہیں کسی تحریک و تنظیم کا باقاعدہ ذکر موجود نہیں ہے لیکن اس کتاب میں جس استدلال کو سامنے رکھتے ہوئے جو تنقید ہوئی اس سے بالکل واضح ہوتا ہے کہ کتاب عالمی جہادی فکر کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ میری نظر میں یہ کتاب عالمی جہادی فکر یا اگر عمومی بات کی جائے تو انتہا پسندانہ اور شدت رکھنی والی فکر کا بہترین انداز سے احاطہ کرتی ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی کو علمی حلقوں میں "مسلکِ اعتدال، مسلک رخصت" کے مفکرین میں گنا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ان کی یہ حیثیت بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس کتاب کا جائزہ اور اس سے استفادے کے لیے ہم اس اردو ترجمے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا، جو ہندوستان کے معروف عالم دین مولانا سلمان ندوی نے "اسلامی بیداری: انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں" کے عنوان سے کیا ہے۔ ترجمے کے عیوب و محاسن کا ذکر ہمارے دائرہ تحقیق سے باہر ہے، اس لیے اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ کتاب کا عربی متن بھی ہمارے پیش نظر ہے۔

علامہ یوسف القرضاوی نے مذکوہ کتاب میں بڑی معروضیت کے ساتھ ان مسائل کا ذکر کیا ہے جو عالمی جہادی تحریک اور موجودہ مغربی تہذیب کے درمیان بنائے نزاع ہیں۔ انہوں نے شدت پسند فکر کی نشانیاں اور اسباب بیان کئے اور اس کا حل تجویز کیا ہے۔ شدت کے اسباب کے تحت انہوں نے اسلام اور اس کی غلط تفہیم کے ساتھ ساتھ مغربی اقوام اور مسلم حکمرانوں کے رویے کو بھی شدت پسندی کے بڑے اسباب میں ذکر کیا۔

علامہ یوسف القرضاوی نے مذکورہ کتاب میں شدت پسندانہ فکر کو ظاہریت، تکفیریت اور خارجی فکر کا شاخسانہ کہا ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے کہ جہادی فکر میں اصول دین، اصول فقہ، مقاصد الشریعہ، اور خاص احکام کو عام کر دینے کی علمی غلطیاں موجود ہیں۔ انہوں نے شدت پسندی کے ان مظاہر کا بھی ذکر کیا ہے جو زورمرہ کے مسائل یا معاشرتی معاملات میں سامنے آتے ہیں۔ القرضاوی نے شدت کے اسباب میں ایک طرف تو دین اور دینی علوم سے ناواقفیت کو ذکر کیا ہے تو دوسری طرف اس سیاسی ماحول کو بھی زیر بحث لائے ہیں جس کے سبب شدت پسندانہ فکر کو پذیرائی ملی ہے۔ انہوں نے مغربی اقوام کے جبر اور وحشت کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کے حکمرانوں کی دینی کمزوری، استعمار کے آگے جھکنے اور مغربی اقوام کی طرف سے آنے والے لائحہ عمل کو ہو بہو لاگو کرنے کو شدت پسندی کا سبب کہا ہے، جس کی وجہ سے مسلم نوجوانوں کا اپنے حکمرانوں سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ صرف حکمرانوں تک موقوف نہیں، القرضاوی نے علما کو زیر بحث لاتے ہوئے کہا کہ علماء کی طرف سے مداہنت اور مصلحت اندیشی نے مسلم نوجوانوں کو اپنے علماء سے بد ظن کر دیا ہے جس کی وجہ وہ خالص دینی معاملات میں بھی علماء کی طرف رجوع نہیں کرتے، اور کتابوں کو خود پڑھتے ہیں، اور خود ہی اپنی سمجھ کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور اس کو دوسرے مسلمانوں پر نافذ کرنے کی ضد کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں علامہ القرضاوی نے مسلم حکمرانوں اور

علماء کو مشورہ دیا ہے کہ مسلم نوجوان کو شفیق اور خیر خواہ بزرگ کی حیثیت سے سمجھائیں، ان کی بات، ان کے اشکالات کو غور سے سنیں تاکہ ان کے اشکالات دور ہوں۔ علامہ یوسف القرضاوی نے شدت پسندی کے جواب میں شدت پسندانہ رویے پر سخت نکیر ہے۔ ان کے مطابق اس رویے سے حالات سنبھلنے کے بجائے مزید بگاڑ کی طرف جائیں گے۔

شدت پسندی کی نشانیاں، اس کے اسباب اور اس کے حل کے لیے علامہ القرضاوی نے الگ الگ ابواب باندھنے کے بعد آخری باب میں مسلم نوجوان کو مشورے دیے ہیں۔ چونکہ اس کتاب میں شدت پسندانہ فکر کو عمومی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے اس لیے میری نظر میں یہ کتاب، علامہ یوسف القرضاوی کے اس پورے علمی کام کی تلخیص ہے جو وہ وقتاً فوقتاً سپرد قلم کرتے رہے ہیں۔ مذکوہ کتاب میں علامہ یوسف القرضاوی نے بڑی تفصیل کے ساتھ جہادی فکر کی مذہبی بنیادوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انہوں عالمی جہاد کے سیاسی استدلال کو زیر بحث لاتے ہوئے مغربی اقوام اور مسلم حکمرانوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔[14]

عالمی جہادی تحریک کے استدلال پر جو بنیادی تنقید ہوئی ہے کہ اس میں یہ نکتہ اہم ہے کہ جہادیوں کے استدلال میں سلف کے بجائے خلف کی فکر کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ جیسے ابن تیمیہ، ابن کثیر۔ اور اسی طرح تنقید میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جہادی اپنے استدلال کے لیے قرآن و سنت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر استدلال کرتے ہیں۔[15] اس ضمن میں یوسف القرضاوی کا خیال ہے کہ شدت پسندی کی طرف جانے والے نوجوان اسلام اور اصولِ فقہ وغیرہ سے ناواقف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا استدلال کمزور بنیادوں پر اٹھتا ہے۔[16]

جان کیلسے (John Kelsay) نے جہادی فکر کو سمجھتے ہوئے ایک نوجوان منیر محمد ابوسلہا کے کیس کو سامنے رکھا ہے۔ جس نے 15 مئی 2014 میں شام میں خود کش حملہ کیا تھا اور بعد میں اس کی وہ ویڈیو ریلیز ہو گئی جو انہوں نے حملے سے قبل ریکارڈ کروائی تھی۔ جان کیلسے نے اس کیس سٹڈی کو بنیاد بناتے ہوئے کہا کہ ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھا مسلمان بنے، اچھے مسلمان کی تعریفیں مسلم دنیا میں ایک سے زائد ہیں، ان میں اس تصور وہ ہے جو جہادی فکر کی بنیاد ہے، جس کے تحت کھیل کود میں مصروف لوگ اچھے مسلمان نہیں، کیونکہ مسلم دنیا اس وقت اپنے دشمنوں یعنی مغربی ممالک کے ساتھ مصروف پیکار ہے۔ جان کیلسے کے مطابق اچھے مسلمان کے اسی تصور نے منیر محمد ابوسلہا کو اس رستے پر چلنے میں مدد دی۔

اسی مقالے میں جان کیلسے نے لکھا ہے کہ جہادی فکر کو جاننے کے لیے بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ کس کو مسلمان یا اچھا مسلمان کہتے ہیں۔ جان کیلسے کے تجزیے کے مطابق، عالمی جہادی فکر میں اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی طرف سے سامنے آئے ہوئے فتوی، "صلیبیوں اور یہودیوں کے خلاف اعلانِ جہاد" (Declaration concerning Jihad against Jews and Crusaders) کو بنیادی حیثیت ہے۔ جس میں امت کو یہودیوں اور صلیبیوں کے حملے کی زد میں بتایا گیا ہے۔ اسی فتوی کے تناظر میں وہ جہاد کو فرض عین مانتے ہیں اور ہر مسلمان کی اچھائی کو فرض عین کی ادائیگی سے مشروط کر دیتے ہیں۔

جان کیلسے کے مطابق عالمی جہادی فکر میں دو بنیادی مذہبی نقائص ہیں، ایک یہ کہ اس کی بنیادیں بعد کے علما کی فکر پر استوار ہیں۔ بعد کے علما سے ان کی مراد ابن کثیر اور ابن تیمیہ ہیں۔ اور دوسرا نقص یہ ہے کہ مذہبی نصوص سے استدلال کرتے ہوئے اس کے سیاق و سباق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ جان کیلسے نے اپنے مقالے میں داعش کے اعلان خلافت اور مسلم علماء کی طرف سے سامنے آنے والی تنقید کو بھی شامل رکھا ہے۔ داعش کے اعلان خلافت کے خلاف جامعۃ الازہر کا فتوی اور یوسف القرضاوی کی تنقید کو اس مقالے میں ذکر کیا گیا ہے۔ جان کیلسے نے مقالے کا اختتام اس بات پر کیا ہے کہ داعش اور القاعدہ کے بیانیے کو رد کر دینا سہل نہیں ہے، اور اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ ان کا بیانیہ مسلم دینی متون اور روایت میں گہرائی سے پیوست ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں مسلم مفکرین ہی ہماری معاونت کر سکتے ہیں۔[17]

عالمی جہادی فکر کی روایت اور دینی متون میں جس پیوستگی کا ذکر جان کیلسے اپنے مقالے میں کر چکے ہیں اور جس طرح انہوں نے کہا کہ اس کا مقابلہ کچھ سہل نہیں ہے الا یہ کہ مسلم اہل علم اس میں ہماری معاونت کریں، اسی تسلسل میں معلوم ہونا چاہیے کہ عالمی جہادی فکر اور روایت میں تصور جہاد کے بارے میں مسلمانوں کی طرف سے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے علماء میں ڈاکٹر عمار خان ناصر نے اس ضمن میں وقیع کام سر انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر عمار خان ناصر کے زیر ادارت نکلنے والا الشریعہ نامی ماہنامہ اس حوالے سے اچھی پہچان رکھتا ہے کہ اس میں علمی اختلاف کو بڑی وسعت قلبی سے جگہ ملتی ہے۔ مارچ، 2012 میں الشریعہ کا خصوصی شمارہ، بعنوان "جہاد-کلاسیکی و عصری تناظر میں" طبع ہوا ہے۔ اسی خصوصی شمارے میں، عمار خان ناصر کی طرف سے 'جہاد- ایک مطالعہ' کے عنوان سے تقریباً اڑھائی سو صفحات پر پھیلا ہوا ایک مقالہ شامل ہے۔ بعد ازاں یہ تحقیقی و علمی کام المورد، لاہور سے کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔

اس کتاب میں جناب عمار خان ناصر، براہ راست القاعدہ یا کسی مخصوص تحریک کے تصور جہاد کو تو زیر بحث نہیں لائے لیکن جن بنیادوں پر جدید مسلم تحریکیں اور بالخصوص جہادی فکر استوار ہے، اس پر تنقید کی ہے۔ انہوں نے جہاد کے احکام کو اتمام حجت، رسول اللہ ﷺ اور ان کی جماعت کے ساتھ مخصوص کرتے ہوئے، اس پر تنقید کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلام کی عالمگیریت پر سوالات اٹھائے ہیں۔ جزیہ اور اس کی خصوصیت اور تنسیخ کے حوالے سے بھی اس مقالے میں تفصیلی بحث ہوئی ہے۔

جہاد اور اس سے متعلقہ احکامات کی عمومیت اور اسلام کی عالمگیریت کو زیر تنقید لاتے ہوئے انہوں نے دینی روایت سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظر میں عالمگیریت اسلام میں صرف امام شافعی کی ایک رائے تھی۔ نیز انہوں نے ترک اور حبشہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے احادیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کی عالمگیریت رسول اللہ ﷺ کے بھی پیش نظر نہ تھی۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض اقوال کو بنائے استدلال بناتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقوال سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں اسلام کی عالمگیریت، ہدف نہیں تھا۔ جناب عمار ناصر کے مطابق جہاد کے احکام رسول اللہ ﷺ کی حیثیت رسالت کی وجہ سے تھے۔ مکہ والوں سے جہاد کرنے کی علت یہ تھی کہ یہ شہر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور

ان کے توحیدی دین کے لیے خاص تھا۔ اسی طرح انہوں نے عرب کے معاملے میں بھی اسی طریق استدلال کو استعمال کرتے ہوئے لکھاہے کہ عرب میں مشرکین کا صفایا دراصل اتمام حجت کے خدائی قانون کی وجہ سے تھا۔ اہل کتاب سے جزیے کے سلسلے میں بعد کی اور خصوصا ہندوستان کی شہادت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ یہ حکم مستقل نہیں تھا، اس لیے ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں کچھ محدود مدت کے علاوہ جزیہ نافذ نہیں رہا۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہی جہاد عرب کی سرحدوں سے باہر نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے لیے عمار خان ناصر رسول اللہ ﷺ کے ان خطوط کو استدلال کی بنیاد بناتے ہیں جو آپ علیہ السلام نے دوسری ریاستوں کے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کے لیے لکھے تھے۔ عمار ناصر کی نظر میں ان خطوط کے ذریعے ان پر اتمام حجت ہوا تھا، اسی اتمام کے تحت ان کے ساتھ جہاد کرنا دینی فریضہ قرار پا گیا تھا جس کو رسول اللہ ﷺ کی جماعت یعنی صحابہ نے انجام دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے خطوط کے دائرے سے باہر کی جہادی سرگرمیوں کو عمار ناصر نے اپنی کتاب میں سیاسی ضرورت، دفاعی ضرورت کے تحت جواز دیا ہے۔ ان کی اس پوری فکر سے اگر ہم محتاط نتائج اخذ کریں گے، تو وہ یہی ہوں گے کہ عمار ناصر ایک تکثیریت پسند معاشرت کے بھی قائل ہیں، اور ان کے خیال میں اسلام اور دینی روایت اس معاملے میں مانع نہیں ہے۔

جس طرح جناب عمار ناصر نے اسلام کی عالمگیریت کی رائے کو محض امام شافعی کی رائے قرار دیا ہے، ہماری نظر میں اس سے کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا، امام شافعی جلیل القدر امام ہیں، اور ان کے نام سے ایک پورا مذہب، دینی روایت میں چل رہا ہے۔ ان کی رائے ایک مذہب کے بانی کی رائے کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے اثرات دینی روایت پر قرین قیاس ہیں۔

یاد رہے کہ اتمام حجت اور بعض احکام کو رسول اللہ ﷺ اور انؐ کے اصحاب رضی اللہ عنھم کے ساتھ مخصوص کر دینا جاوید احمد غامدی کا اسلوبِ تعبیرِ دین ہے۔ جناب عمار ناصر، جاوید غامدی کو اپنا استاد مانتے ہیں اور کئی ایک تعبیرات میں وہ جاوید احمد غامدی کی پیروی کرتے ہیں۔ جہاد سے متعلقہ احکام میں جناب جاوید غامدی کا مؤقف بھی اتمام حجت اور مخصوص کر دینے کی بنیاد پر کھڑا ہے۔

ہندو پاک میں ایک اور نام بھی علمی حلقوں میں معروف ہے، ہماری مراد مولانا وحید الدین خاں سے ہے۔ مولانا وحید الدین خاں کا ابتدائی تعلق جماعت اسلامی سے تھا لیکن بعض اختلافات کی بنا پر وہ جماعت اسلامی کو چھوڑ کر چلے گئے، اور بعد میں جماعت اسلامی کی بنیادی فکر پر بڑی زور دار تنقید کرتے رہے۔ ان کی کتاب 'تعبیر کی غلطی'، مولانا مودودی کے ان تصورات کے خلاف ہے جس میں مولانا مودودی نے سیاست اور دین کی اقامت کو بنیادی ترین فریضہ قرار دیا ہے۔ مولانا مودودی کی اس فکر کو مغربی مفکرین کے ہاں سیاسی اسلام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مولانا مودودی کی کے سیاسی و دینی تصورات کی بنیاد، ان کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں: الہ، ربّ، عبادت، دین" پر ہے۔ یاد رہے کہ سیاسی اسلام پر تحقیق کرنے والوں کے ہاں عالمی جہادی تحریک بھی سیاسی اسلام کی ایک شکل ہے۔

مولانا وحید الدین خاں اپنی کتاب "دین اور شریعت" میں ایک باب بعنوان 'جہاد کا تصور اسلام میں' باندھتے ہیں۔ اس باب کا لب لباب یہی ہے کہ اسلام کی خدمت کے لیے ہر وہ طریقہ جس میں قوت اور تشدد کا استعمال ہو، عہد حاضر میں غلط ہے۔ وہ موجودہ دور کے اندر قتال کو تشدد کا نام دیتے ہیں۔ اور انہوں نے مذکورہ باب میں اس انداز سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فی اصل پر تشدد طریقوں کے حق میں نہیں تھے۔ خان صاحب کی نظر میں عصر حاضر کے لیے سب سے مؤثر طریقہ پرامن طریقہ ہے۔

مولانا وحید الدین خاں کے مطابق قتال کے احکام عام نہیں ہیں۔ قتال اس دور کی مجبوری تھی۔ ان کے مطابق اسلام کا عمومی حکم پرامن طریقہ ہے، تشدد کی اجازت بامر مجبوری دی گئی تھی۔ وہ قتال فی سبیل اللہ کو پر تشدد طریقوں کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ تشدد سابقہ زمانوں کی مجبوری تھی، موجودہ دور میں پرامن طریقہ ہی درست طرز عمل ہے۔ 'زمان و مکان کی تبدیلی سے احکام میں تغیر آتا ہے'، فقہ کے اس اصول کو لاگو کرتے ہوئے مولانا وحید الدین خاں صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پر تشدد طریقہ یعنی قتال اُس زمان کی مجبوری تھی، اب زمانہ بدل گیا ہے اور پرامن طریقے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اس لیے اب قتال کے احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔

سفارشات برائے تحقیق مزید

تہذیبوں کے تصادم میں مسلح صورتِ کشمکش بھی شامل ہے۔ اور تصادم کی نظریاتی، فکری اور معاشرتی صورتوں کے علاوہ مسلح صورت اپنی نوعیت میں سب سے زیادہ شدت رکھتا ہے۔ جنگ و جہاد تصادم کی شدید ترین صورت ہے۔ ہماری نظر میں ایسے ہر تصادم کے لیے، اسی نوعیت کے استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ عالمی جہادی تحریک کے ہاں چونکہ تصادم کی مسلح صورت واضح ہے، اس لیے ان کے نظام استدلال کا گہرا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ اور تصادم کی شدید نوعیت کو استدلال کے ضمن میں رکھتے ہوئے، استدلال کا جائزہ ضرور لینا چاہیے۔ یہ امکان ہے کہ تصادم کی شدت کے مقابلے میں اس کا استدلال اتنا گہرا اور مضبوط نہ ہو۔ تہذیبوں کے مابین تصادم یا مکالمے کی مختلف صورتوں اور ان کے استدلالی نظام کا عموماً جائزہ لیا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلح تصادم کے لیے قائم ہونے والے استدلالی نظام کا بھی جائزہ لیا جائے۔ اور تصادم و مکالمہ کے لیے قائم ہونے والے مختلف استدلالات کے مابین تقابل اور اسی کے ساتھ ساتھ اس پر آنے والی تنقیدات کو سامنے رکھتے ہوئے مسلح جدوجد پر یقین رکھنے والوں کے استدلال کا جائزہ بھی اہم ہے۔

عالمی جہاد سے متعلق جو رویے تشکیل پاتے ہیں عموماً ان رویوں کی استدلالی بنیادیں غیر واضح ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے تائید یا تنقید میں نقص رہ جاتا ہے۔ جہادیوں کو خارجی یا ظاہری کہنا اپنی نوعیت میں مذہبی استدلال پر مذہبی زاویے سے تنقید ہوتا ہے۔[18] اسی طرح ان کو رجعت پسند، شدت پسند، دقیانوس، دہشت گرد وغیرہ کہنا، ایسی تنقید اپنی نوعیت میں سیاسی ہوتی ہے۔

عالمی جہادی تحریک کے حوالے سے کسی بھی تنقیدی کام کے لیے ضروری ہے کہ اس کی استدلالی بنیادیں واضح ہوں۔ استدلال کی نوعیت جاننا اور اس پر آنے والی تنقید کو سامنے رکھتے ہوئے استدلال کی کمزوری یا قوت کا جائزہ لینا، ایک اہم تحقیقی کام کہلا سکتا ہے۔ اس تحقیق کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مسلح تصادم پر یقین رکھنے والے عالمی جہاد

کے نظام استدلال کو سمجھا جائے۔ اس استدلال کی نوعیت میں فرق کرتے ہوئے اس پر سامنے آنے والی تنقید کا جائزہ لیا جائے۔ اس سے علمی دنیا کے لیے استدلال کے نوعیت کو سمجھنے اور اسی کے مطابق تنقیدی رویہ اپنانے میں سہولت ہو گی۔ نیز اب تک سامنے آنے والی تنقید کے جائزے سے تنقید کی حیثیت و نوعیت کا جاننا بھی ممکن ہو جائے گا۔

حاصل بحث

عالمی جہاد اور اس کی فکری بنیادیں نائن الیون سے قبل ہی زیر بحث آنا شروع ہو گئی تھیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نو آبادیاتی نظام کے قیام کے بعد ہی سے اس نوعیت کے مباحث کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن ان مباحث کو افغانستان سے روس کے انخلا کے بعد ایک نئی زندگی مل گئی۔ اور اس بحث کو اسلام اور مغرب کے درمیان تعلق کی نوعیت جیسے مباحث میں مرکزی حیثیت نائن الیون کے بعد مل گئی۔ بلاشبہ اسلام اور مغرب کے تعلق پر سامنے آنے والی تحقیقات میں جہادی فکر کو سمجھنے اور اس پر تنقید کرنے یا اس کا راستہ روکنے پر بہت زیادہ تحقیقات سامنے آئی ہیں۔ بڑے بڑے ادارے اور شعبہ جات صرف اسی فکر کو سمجھنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ ان تمام باتوں سے اس میدانِ تحقیق کی اہمیت واضح ہے۔ مغرب و مشرق کی تحقیقی دنیا میں عالمی جہاد، اس کے استدلال کی نوعیت پر بہت کام ہو چکا ہے۔ اور اس شعبے میں بہت سارا کام ہونا باقی ہے۔ اسی میں ایک کام اس استدلال کی نوعیت جاننا اور نوعیت کے اعتبار سے آنے والی تنقید کا جائزہ لینا ہے۔ استدلال اور اس کی نوعیت جانے بغیر تنقید میں بے شمار نقائص کا قوی امکان ہے۔ مثلاً یہ کہ استدلال کی نوعیت مذہبی ہے اور تنقید سیاسی اور عصری تناظر میں ہو تو وہ تنقید استدلال کی بنیادوں سے مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے بے وقعت ہو جائے گی، یا اسی طرح اگر استدلال کی نوعیت سیاسی اور تنقید مذہبی استدلال پر مبنی ہو تو ساری تنقید غلط بنیادوں پر استوار رہے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حواشی و حوالہ جات

[1] : مغربی تہذیب، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تعلق کو جاننے کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

ابو طارق۔ ایم۔ اے، مولانا مودودی کے انٹرویو، (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، جنوری 1976ء)، 266-262؛

جاوید اکبر انصاری، سرمایہ داری کے نقیب، (لاہور: لیکسی بکس، ستمبر 2019)، 161-164

Abu Tariq. M. A, Interviews with Maulana Maududi, (Lahore: Islamic Publishers Limited, January 1976), 266-226;

Javed Akbar Ansari, Champions of Capitalism, (Lahore: Lexibooks, September 2019), 161-164

[2] : مکالمے اور تصادم کے حوالے سے ہونے والے مباحث کے لیے دیکھیے:

Ansari, Zafar Ishaq, John L. Esposito *"Muslim and the West: Encounter and Dialogue"*, (Islamabad: Islamic Research Institute, IIUI; Center for

Muslim-Christian Understanding, Georgetown University, Washington, D.C., 2001).

[3] :اس تقسیم کی بنیادوں کو دیکھنے کے لیے ملاحظہ فرمائیں:سید ابوالاعلی مودودی، تنقیحات،(لاہور:اسلامک پبلی کیشنز،2016)۔

Syed Abul Ali Maududi, Tanqihat, (Lahore: Islamic Publications, 2016).

[4] :یوسف القرضاوی،سید مودودیؒ:مفکر، مجدد، مصلح،ت،ابوالاعلی سید سبحانی(لاہور:منشورات، ستمبر2016)،119.

Yusuf Al-Qaradawi, Syed Maududi: Thinker, Mujaddid, Masleh, T., Abu-Ali Syed Subhani (Lahore: Manifestos, September 2016), 119

[5]: Thomas Hegghammer, *"Global Jihadism after the Iraq War,"* Middle East Journal, Vol. 60, No. 1 (winter, 2006), 13

[6]: Sebastian Schnelle. *"Abdullah Azzam, Ideologue of Jihad: Freedom Fighter of Terrorist?"*, Journal of Churuch and State, Vol. 54, no. 4 (Autumn 2012): 629; Joas Wagemakers, *"Framing the "Threat to Islam": Al-WALA' WA AL-BARA' In Salafi Discourse,"* Arab Studies Quarterly, Vol. 30, no. 4 (Fall 2008), 4-8

[7]: Joas Wakemakers, *"A Purist Jihadi-Salafi: The Ideology of Abu Muhammad al-Maqdisi,"* British Journal of Middle Eastern Studies, Vol. 36, no. 2 (AUGUST 2009), 287-288; See Also: Joas Wagemakers, "Framing the "Threat to Islam": Al-WALA' WA AL-BARA' In Salafi Discourse," Arab Studies Quarterly, Vol. 30, no. 4 (Fall 2008), 6-8

[8]: Joas Wakemakers, *"A Purist Jihadi-Salafi: The Ideology of Abu Muhammad al-Maqdisi,"* British Journal of Middle Eastern Studies, Vol. 36, no. 2 (AUGUST 2009), 281-297

[9]: Kumar Ramakrishna, *"Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia,"* Contemporary Southeast Asia, 349-350

[10]: Kumar Ramakrishna, *"Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia,"* Contemporary Southeast Asia, 360

[11]: Zuhur, Sherifa. "Dispatches from the Global Terror Industry." *Review of Middle East Studies* 44, no. 2 (2010): 224-225

[12]: Muhammad Samiullah, "Contemporary Western Approaches towards Radical Islamic Movements : The case of Bernard Lewis and J L Esposito", (Ph.D Thesis: University of Punjab, 2012), 54; Cragin, R. Kim. *"Early History of Al-Qa'ida,"* The Historical Journal, Vol. 52, No. 4 (Dec., 2008): 1058

[13]: https://www.jstor.org/stable/23057160, Accessed: 17-10-2019 08:05 UTC

[14] : یوسف القرضاوی، الصحوۃ الاسلامیۃ بین الجحود والتطرف، (قطر، دوحہ: کتاب امۃ، شوال 1406)؛ یوسف القرضاوی، اسلامی بیداری: انکار اور انتہاپسندی کے نرغے میں، ت، سلمان ندوی (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت،---)

Yusuf al-Qaradawi, Sahaw al-Islamiyyah been al-juhud wa al-taraf, (Qatar, Doha: Kitab Ummah, Shawwal 1406); Yusuf Al-Qaradawi, Islamic Awakening: In the Age of Denial and Extremism, by Salman Nadwi (Lahore: School of Humanity Construction, ---)

[15]: John Kelsay, "Muslim Discourse about Jihad and the Counter-narratives Project," Soundings: An Interdisciplinary Journal, Vol. 98, No. 4 (2015), 453

[16]: یوسف القرضاوی، اسلامی بیداری: انکار اور انتہاپسندی کے نرغے میں، ت، سلمان ندوی (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ---)، 184

Yusuf Al-Qaradawi, Islamic Awakening: Between Denial and Extremism, by Salman Nadwi (Lahore: School of Humanity, 184)

[17]: John kelsay , "Muslim Discourse about Jihad and the Counter-narratives Project," Soundings: An Interdisciplinary Journal, 457-458

[18] : Angel Rabasa, Peter Chalk, Kim Cragin, Sara A. Daly, Healther S. Gregg, Theodore W. Karasik, Kevin A. O'Brien and William Rosenau. *"Al-Qaeda's Ideology and Proaganda," In Beyond al-Qaeda: Part 1, The Global Jihadist Movement,"* (US: RAND Corporation, 2006), 9-10; See Also: Kumar Ramakrishna, *"Delegitimizing Global Jihadi Ideology in Southeast Asia,"* Contemporary Southeast Asia, Vol. 27, no. 3 (December 2005), 352; See Also:

یوسف القرضاوی، اسلامی بیداری: انکار اور انتہاپسندی کے نرغے میں، 58؛67

Yusuf al-Qaradawi, Islamic Awakening: In the Torture of Denial and Extremism, 58; 67